ایک اداکار اور اداکارہ کی کہانی

جو کیمرے پر منتقل نہیں ہوتے، مگر منٹو کے شیشے سے چھپ نہ سکے

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب جنگ کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ غالباً آٹھ نو برس پہلے کی بات ہے، جب زندگی میں ہنگامے بڑے سلیقے سے آتے تھے، آج کل کی طرح نہیں کہ بے ہنگم طریقے پر پے در پے حادثے برپا ہو رہے ہیں، کسی ٹھوس وجہ کے بغیر۔ اُس وقت میں چالیس رُوپے ماہوار پر ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا اور میری زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاں و خیزاں گزر رہی تھی، یعنی صبح دس بجے اسٹوڈیو گئے، نیاز محمد ولن کی بلیوں کو دو پیسے کا دودھ پلایا، چالو فلم کے لیے چالو قسم کے مکالمے لکھے، بنگالی ایکٹریس سے جو اُس زمانے میں بلبل بنگال کہلاتی تھی، تھوڑی دیر مذاق کیا اور دادا گورے کی جو اس عہد کا سب سے بڑا فلم ڈائرکٹر تھا، تھوڑی سی خوشامد کی اور گھر چلے آئے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ زندگی بڑے ہموار طریقے پر افتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ اسٹوڈیو کا مالک ہرمزجی فرامزجی جو موٹے موٹے گالوں والا اموجی قسم کا ایرانی تھا، ایک ادھیڑ عمر کی خوجہ ایکٹریس کی محبت میں گرفتار تھا۔ "بن کی سندری" کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ نیاز محمد ولن کی جنگلی بلیوں کو جو اُس نے خدا معلوم اسٹوڈیو کے لوگوں پر کیا اثر پیدا کرنے کے لیے پال رکھی تھیں، دو پیسے کا دودھ پلا کر میں ہر روز اس "بن کی سندری" کے لیے ایک غیر مانوس زبان میں مکالمے لکھا کرتا تھا۔ اس فلم کی کہانی کیا تھی، پلاٹ کیسا تھا، اس کا علم جیسا کہ ظاہر ہے، مجھے بالکل نہیں تھا کیونکہ اُس زمانے میں میں ایک منشی تھا جس کا کام صرف حکم ملنے پر جو کچھ کہا جائے، غلط سلط اردو میں جو ڈائرکٹر صاحب کی سمجھ میں آ جائے، پنسل سے ایک کاغذ پر لکھ کر دینا ہوتا ہے۔ خیر "بن کی سندری" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور یہ افواہ گرم تھی کہ "ویمپ" کا پارٹ ادا کرنے کے لیے ایک نیا چہرہ سیٹھ ہرمزجی کہیں سے لا رہے ہیں۔ ہیرو کا پارٹ راج کشور کو دیا گیا تھا۔

راج کشور راولپنڈی کا ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کے جسم کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ بہت مردانہ اور سڈول ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس کے متعلق غور کیا مگر مجھے اس کے جسم میں جو یقیناً کسرتی اور متناسب تھا، کوئی کشش نظر نہ آئی مگر اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں بہت ہی دُبلا اور مریل قسم کا انسان ہوں اور اپنے ہم جنسوں کے جسم کے متعلق اتنا زیادہ غور کرنے کا عادی نہیں جتنا

کے متعلق سوچنے کا عادی ہوں مجھے
اُن کے دل ودماغ اور روح
راج کشور سے نفرت نہیں تھی اس لیے کہ میں نے اپنی عمر میں شاذ و
نادر ہی کسی انسان سے نفرت کی ہے مگر وہ مجھے کچھ زیادہ پسند
نہیں تھا۔ اس کی وجہ میں آہستہ آہستہ آپ سے بیان کروں گا۔
راج کشور کی زبان، اُس کا لب ولہجہ جو ٹھیٹ راولپنڈی کا
تھا، مجھے بے حد پسند تھا۔ میرا خیال ہے کہ پنجابی زبان میں اگر کہیں
خوب صورت قسم کی شیرینی ملتی ہے تو وہ راولپنڈی کی زبان ہی
میں آپ کو مل سکتی ہے۔ اس شہر کی زبان میں ایک عجیب قسم کی مردانہ
نسائیت ہے جس میں بیک وقت مٹھاس اور گھلاوٹ ہے اگر راولپنڈی
کی کوئی عورت آپ سے باتیں کرے تو ایسا لگتا ہے کہ لذیذ آم کا رس
آپ کے منہ میں چوایا جا رہا ہے مگر میں آموں کی نہیں، راج کشور کی
بات کر رہا تھا جو مجھے آم سے بہت کم عزیز تھا۔
راج کشور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک خوش شکل اور صحت مند
نوجوان تھا۔ یہاں تک بات ختم ہو جاتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر
مصیبت یہ ہے کہ اُسے یعنی راج کشور کو خود اپنی صحت اور اپنے خوش
شکل ہونے کا احساس تھا۔ ایسا احساس جو کم از کم میرے لیے ناقابلِ
قبول تھا۔ صحت مند ہونا بڑی اچھی چیز ہے مگر دوسروں پر اپنی صحت
کو بیماری بنا کر عائد کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ راج کشور کو یہی مرض
لاحق تھا کہ وہ اپنی صحت اور تندرستی اپنے متناسب اور سڈول اعضا
کی غیر ضروری نمائش کے ذریعے ہمیشہ دوسروں کو جو اُس سے کم صحت مند
تھے، مرعوب کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ میں دائمی مریض ہوں، میرے ایک پھیپھڑے میں ہوا
کھینچنے کی طاقت بہت کم ہے مگر خدائے واحد شاہد ہے کہ میں نے
آج تک اس کمزوری کا کبھی پروپیگنڈا نہیں کیا حالانکہ مجھے اس کا پوری
طرح علم ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے
جس طرح اپنی طاقتوں سے اُٹھاتا ہے مگر میرا ایمان ہے کہ ہمیں
ایسا نہیں کرنا چاہیے۔
خوب صورتی میرے نزدیک وہ خوب صورتی ہے جس کی دوسرے
بلند آواز میں نہیں بلکہ دل ہی دل میں تعریف کریں۔ میں اُس صحت
کو بیماری سمجھتا ہوں جو نگاہوں کے ساتھ پتھر بن کر ٹکراتی رہے۔ راج
کشور میں وہ تمام خوب صورتیاں موجود تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہونی
چاہئیں مگر مجھے افسوس ہے کہ اُسے ان خوب صورتیوں کا نہایت ہی
بھونڈا مظاہرہ کرنے کی عادت تھی۔ آپ سے باتیں کر رہا ہے اور اپنے
ایک بازو کے پٹھے اکڑا رہا ہے اور خود ہی داد دے رہا ہے۔ نہایت ہی
اہم گفتگو ہو رہی ہے یعنی سوراج کا مسئلہ چھڑا ہے اور وہ اپنے کھادی

کے کرتے کے بٹن کھول کر اپنے سینے کی چوڑائی کا اندازہ کر رہا ہے
میں نے کھادی کے کرتے کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ راج کشور
تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی وجہ سے کھادی کے کپڑے پہنتا ہو مگر
دل میں ہمیشہ اس بات کی کھٹک رہی ہے کہ اُسے اپنے وطن سے
پیار نہیں تھا، جتنا اسے اپنی ذات سے تھا۔ بہت سے لوگوں کا
تھا کہ راج کشور کے متعلق جو میں نے رائے قائم کی ہے سراسر غلط ہے
اس لیے کہ اسٹوڈیو اور اسٹوڈیو کے باہر ہر شخص اس کا مداح تھا
جسم کا، اُس کے خیالات کا، اُس کی سادگی کا، اُس کی زبان کا
راولپنڈی کی تھی اور مجھے بھی پسند تھی۔ دوسرے ایکٹروں کی طرح
تھلگ رہنے کا عادی نہیں تھا۔ کانگریس پارٹی کا کوئی جلسہ ہو تو راج
کو آپ وہاں ضرور موجود پائیں گے، کوئی ادبی میٹنگ ہو رہی ہے
راج کشور ضرور پہنچے گا۔ اپنی مصروف زندگی میں سے وہ اپنے ہمسایوں
اور معمولی جان پہچان کے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے
بھی وقت نکال لیا کرتا تھا۔ سب پروڈیوسر اُس کی عزت کرتے تھے
کیونکہ اُس کے کیریکٹر کی پاکیزگی کا بہت شہرہ تھا۔ پروڈیوسروں کی
پبلک کو بھی اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ راج کشور ایک بہت بلند
کردار کا مالک ہے۔ فلمی دُنیا میں رہ کر کسی شخص کا گناہ کے دھبوں سے
پاک رہنا بہت بڑی بات ہے۔ یوں تو راج کشور ایک کامیاب ہیرو تھا
مگر اُس کی اس خوبی نے اُسے ایک بہت ہی اُونچے رتبے پر پہنچا دیا تھا۔
ناگ پاڑے میں جب میں شام کو پان والے کی دکان پر بیٹھتا
تو اکثر ایکٹر ایکٹریسوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ قریب قریب ہر ایکٹر
اور ایکٹریس کے متعلق کوئی نہ کوئی اسکینڈل مشہور تھا مگر راج کشور کا
جب بھی ذکر آتا، شیام لال پنواڑی بڑے فخریہ لہجہ میں کہا کرتا۔
"منٹو صاحب! راج بھائی ہی ایسا ایکٹر ہے جو لنگوٹ کا پکا ہے۔"
معلوم نہیں شیام لال اُسے راج بھائی کیسے کہنے لگا تھا مگر اس
متعلق مجھے اتنی حیرت بھی نہیں تھی اس لیے کہ راج بھائی کی معمولی
بات بھی ایک کارنامہ بن کر لوگوں تک پہنچ جاتی تھی۔ مثلاً باہر کے
کو اُس کی آمدنی کا پورا حساب معلوم تھا۔ اپنے والد کو ماہوار خرچ کیا
ہے، یتیم خانوں کے لیے کتنا چندہ دیتا ہے، اُس کا اپنا جیب خرچ
ہے۔ یہ سب باتیں لوگوں کو اس طرح معلوم تھیں جیسے انھیں
کرائی گئی ہیں۔ شام لال نے ایک روز مجھے بتایا کہ راج بھائی کا
سوتیلی ماں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک ہے۔ اُس زمانے میں
آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ باپ اور اُس کی نئی بیوی نے اُسے طرح طرح
کے دکھ دیئے تھے مگر مرحبا ہے راج بھائی پر کہ اُس نے اپنا فرض
کیا اور اُن کو اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی، اب دونوں چھپر کھٹ پر

راج کرتے ہیں۔ ہر روز صبح سویرے راج اپنی سوتیلی ماں کے پاس جاتا ہے اور اُس کے چرن چھوتا ہے۔ باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاتا ہے اور جو حکم ملے فوراً بجا لاتا ہے۔

آپ بُرا نہ مانیے گا مگر مجھے راج کشور کی تعریف و توصیف سُن کر ہمیشہ اُلجھن سی ہوتی تھی، خدا جانے کیوں؟ میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، مجھے اُس سے حاشا و کلاّ نفرت نہ تھی۔ اُس نے مجھے کبھی ایسا موقع ہی نہیں دیا تھا اور پھر اُس زمانے میں جب منشیوں کی کوئی عزت و وقعت ہی نہیں تھی، وہ میرے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا، کیا وجہ تھی لیکن ایمان کی بات ہے کہ میرے دل و دماغ کے کسی اندھیرے کونے میں یہ شک بجلی کی طرح کوند جاتا کہ راج بن رہا ہے، راج کی زندگی بالکل مصنوعی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ میرا کوئی ہم خیال نہیں تھا۔ لوگ دیوتاؤں کی طرح اُس کی پوجا کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں کُڑھتا تھا۔ راج کی بیوی تھی، راج کے چار بچے تھے، وہ اچھا خاوند اور اچھا باپ تھا۔ اُس کی زندگی سے چادر کا کوئی کونا بھی اگر ہٹا کر دیکھا جاتا تو آپ کو کوئی تاریک چیز نظر نہ آتی۔ یہ سب کچھ تھا مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی میرے دل میں شک کی گدگدی ہوتی ہی رہتی تھی۔

خدا کی قسم میں نے کئی دفعہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کی کہ تم بڑے ہی واہیات ہو کہ ایسے اچھے انسان کو جسے ساری دُنیا اچھا کہتی ہے اور جس کے متعلق تمہیں کوئی شکایت بھی نہیں، کیوں بے کار شک کی نظروں سے دیکھتے ہو۔ اگر ایک آدمی اپنا سڈول بدن بار بار دیکھتا ہے تو یہ کون سی بُری بات ہے۔ تمہارا بدن بھی اگر ایسا ہی خوب صورت ہوتا تو بہت ممکن ہے، تم بھی یہی حرکت کرتے۔

کچھ بھی ہو مگر میں اپنے دل و دماغ کو کبھی آمادہ نہ کر سکا کہ وہ راج کشور کو اُسی نظر سے دیکھے جس سے دُوسرے دیکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ میں دورانِ گفتگو اکثر اُس سے اُلجھ جایا کرتا تھا۔ میرے مزاج کے خلاف کوئی بات کی اور میں ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گیا لیکن ایسی چپقلشوں کے بعد ہمیشہ اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ اور میرے حلق میں ایک ناقابلِ بیان تلخی رہی۔ مجھے اس سے اور بھی زیادہ اُلجھن ہوتی تھی۔ خیر۔

"بن کی سُندری" کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اسٹوڈیو میں خاصی چہل پہل تھی۔ ہر روز ایکسٹرا لڑکیاں آتی تھیں جن کے ساتھ ہمارا دن ہنسی مذاق میں گزر جاتا تھا۔

ایک روز نیاز محمد ولن کے کمرے میں میک اپ ماسٹر جسے ہم اُستاد کہتے تھے، یہ خبر لے کر آیا کہ ویمپ کے رول کے لیے جو نئی لڑکی آنے والی تھی، آ گئی ہے اور بہت جلد اُس کا کام شروع ہو جائے گا۔

اُس وقت چائے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ اُس کی حرارت تھی، کچھ اس خبر نے ہم کو گرما دیا تھا۔ اسٹوڈیو میں ایک نئی لڑکی کا داخلہ ہمیشہ ایک خوش گوار حادثہ ہوا کرتا ہے چنانچہ ہم سب نیاز محمد ولن کے کمرے سے نکل کر باہر چلے آئے تاکہ اُس کا دیدار کیا جائے۔ شام کے وقت جب سیٹھ ہرمز جی فرام جی آفس سے نکل کر عیسیٰ طبلچی کی چاندی کی ڈبیا سے دو خوشبودار تمباکو والے پان اپنے چوڑے کلّے میں دبا کر بلیرڈ کھیلنے کے کمرے کا رُخ کر رہے تھے کہ ہمیں وہ نئی لڑکی نظر آئی۔ سانولے رنگ کی عورت تھی جس میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا کیونکہ وہ جلدی جلدی سیٹھ کے ساتھ ہاتھ ملا کر اسٹوڈیو کی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد مجھے نیاز محمد نے بتایا کہ اُس عورت کے ہونٹ موٹے تھے۔ وہ غالباً صرف ہونٹ ہی دیکھ سکا تھا۔ اُستاد جس نے شاید اتنی جھلک بھی نہ دیکھی تھی، سر ہلا کر بولا۔

"ہونہہ، کنڈم۔" یعنی بکواس ہے۔

چار پانچ روز گزر گئے مگر یہ نئی لڑکی اسٹوڈیو میں نہ آئی۔ پانچویں یا چھٹے روز جب میں گلاب کے ہوٹل سے چائے پی کر نکل رہا تھا، اچانک میری اور اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں ہمیشہ عورتوں کو چور آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ اگر کوئی عورت ایک دم میرے سامنے آ جائے تو مجھے اُس کا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ چونکہ غیر متوقع طور پر میری اُس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی اس لیے اُس کی شکل و شباہت کے متعلق کوئی اندازہ نہ کر سکا البتہ پاؤں میں نے ضرور دیکھے جن میں نئی وضع کے سلیپر تھے لیبارٹری

سے اسٹوڈیو تک جو روش جاتی ہے، اُس پر مالکوں نے بجری بچھا رکھی ہے۔ اُس بجری میں بے شمار گول گول بٹیاں ہیں جن پر سے جوتا بار بار پھسلتا ہے۔ چونکہ اُس کے پاؤں میں کھلے سلیپر تھے اس لیے چلنے میں اُسے کچھ زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

اس ملاقات کے بعد آہستہ آہستہ مس نیلم سے میری دوستی ہو گئی۔

اُس کا اصل نام رادھا تھا۔ میں نے ایک بار اُس سے پوچھا کہ تم نے اتنا پیارا نام کیوں چھوڑ دیا تو اُس نے جواب دیا۔ "یوں ہی۔" مگر پھر دیر کے بعد کہا۔ "یہ نام اتنا پیارا ہے کہ فلم میں استعمال نہیں کرنا چاہتی۔"

آپ شاید خیال کریں کہ رادھا مذہبی خیال کی عورت تھی۔ جی نہیں! اُسے مذہب اور اس کے توہمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن جس طرح میں ہر نئی تحریر شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر بسم اللہ کے اعداد ضرور لکھتا ہوں، اسی طرح شاید اُسے بھی غیر ارادی طور پر رادھا کے نام سے بے حد پیار تھا۔ چونکہ وہ چاہتی تھی کہ اُسے رادھا نہ کہا جائے اس لیے میں آگے چل کر اُسے نیلم ہی کہوں گا۔

نیلم بنارس کی ایک طوائف زادی تھی۔ وہیں کا ٹپ لہجہ جو کانوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میرا نام سعادت ہے مگر وہ مجھے ہمیشہ صادق ہی کہا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اُس سے کہا تھا۔ "نیلم! میں جانتا ہوں، تم مجھے سعادت کہہ سکتی ہو، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اپنی اصلاح کیوں نہیں کرتیں؟"

یہ سن کر اُس کے سانولے ہونٹوں پر جو بہت ہی پتلے تھے، ایک خفیف سی پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے جواب دیا۔ "جو غلطی مجھ سے ایک بار ہو جائے، میں اُسے ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کیا کرتی۔"

میرا خیال ہے، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ عورت جسے اسٹوڈیو کے تمام لوگ ایک معمولی ایکٹریس سمجھتے تھے، عجیب و غریب انفرادیت کی مالک تھی۔ اُس میں دُوسری ایکٹریسوں کا سا اوچھا پن بالکل نہیں تھا۔ اُس کی سنجیدگی جسے اسٹوڈیو کا ہر شخص اپنی عینک سے بالکل غلط رنگ میں دیکھتا تھا، بہت پیاری چیز تھی۔ اُس کے سانولے چہرے پر جس کی جلد بہت ہی صاف اور ہموار تھی۔ یہ سنجیدگی یہ ملیح متانت موزوں و مناسب غازہ بن گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے اُس کی آنکھوں میں، اُس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں، غم کی بے معلوم تلخیاں گھل گئی تھیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اسی چیز نے اُسے دوسری عورتوں سے بالکل مختلف کر دیا تھا۔

میں اُس وقت بھی حیران تھا اور اب بھی ویسا ہی حیران ہوں کہ نیلم کو "بن سندری" میں ویمپ کے رول کے لیے کیوں منتخب کیا گیا اس لیے کہ اُس میں تیزی و طراری نام کو بھی نہیں تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ اپنا واہیات پارٹ ادا کرنے کے لیے تنگ چولی پہن کر سیٹ پر آئی تو میری نگاہوں کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ دوسروں کا ردِعمل فوراً تاڑ جایا کرتی تھی چنانچہ مجھے دیکھتے ہی اُس نے کہا۔ "ڈائرکٹر صاحب کہتے تھے کہ تمہارا پارٹ چونکہ شریف عورت کا نہیں ہے اس لیے تمہیں اس قسم کا لباس دیا گیا ہے۔ میں نے اُن سے کہا، اگر یہ لباس ہے تو میں آپ کے ساتھ ننگی چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے اُس سے پوچھا۔ "ڈائرکٹر صاحب نے یہ سن کر کیا کہا؟"

نیلم کے پتلے ہونٹوں پر ایک خفیف سی پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "انھوں نے تصور میں مجھے ننگی دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ بھی کتنے احمق ہیں۔ یعنی اس لباس میں مجھے دیکھ کر بے چارے تصور پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" ذہین قاری کے لیے نیلم کا اتنا ہی تعارف کافی ہے۔ اب میں اُن واقعات کی طرف آتا ہوں جن کی مدد سے یہ کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں۔

بمبئی میں جون کے مہینے سے بارش شروع ہو جاتی ہے اور ستمبر کے وسط تک جاری رہتی ہے۔ پہلے دو ڈھائی مہینوں میں اس قدر پانی برستا ہے کہ اسٹوڈیو میں کام نہیں ہو سکتا۔ "بن کی سندری" کی شوٹنگ اپریل کے اواخر میں شروع ہوئی تھی۔ جب پہلی بارش ہوئی تو ہم اپنا تیسرا سیٹ مکمل کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا سین باقی رہ گیا تھا جس میں کوئی مکالمہ نہیں تھا اس لیے بارش میں بھی ہم نے اپنا کام جاری رکھا مگر جب یہ کام ختم ہو گیا تو ہم ایک عرصے کے لیے بے کار ہو گئے۔ اس دوران اسٹوڈیو کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔ میں تقریباً سارا دن گلاب کے ہوٹل میں میٹھا چائے پیتا رہتا تھا۔ جو آدمی بھی اندر آتا یا تو سارے کا سارا بھیگا ہوتا تھا یا آدھا۔ باہر کی سب مکھیاں پناہ لینے کے لیے اندر جمع ہو گئی تھیں اس قدر غلیظ فضا تھی کہ الاماں۔ ایک کرسی پر چائے نچوڑنے کا کپڑا پڑا ہے، دوسری پر پیاز کاٹنے کی بدبودار چھری پڑی چمک مار رہی ہے۔ گلاب صاحب پاس کھڑے ہیں اور اپنے گوشت خورہ لگے دانتوں تلے بمبئی کی اُردو چبا رہے ہیں۔ "تم اُدھر جانے کو نہیں سکتا۔ ہم اُدھر سے جا کے آیا۔ بہت لفڑا ہوگا۔ ہاں، بڑا واندا ہو جائے گا۔"

اُس ہوٹل میں جس کی چھت کوروگیٹڈ اسٹیل کی تھی، سیٹھ ہرمزجی فرامزجی ان کے سالے ایڈل جی اور ہیروئنوں کے سوا سب لوگ آتے تھے۔ نیاز محمد کو تو دن میں کئی مرتبہ یہاں آنا پڑتا تھا کیونکہ وہ چنی منی نام کی دو بلیاں پال رہا تھا۔ راج کشور دن میں ایک چکر لگا جاتا تھا۔ جوں ہی وہ اپنے لمبے اور کسرتی بدن کے ساتھ دہلیز پر نمودار ہوتا، میرے سوا ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی آنکھیں تمتما اٹھتیں۔ ایکسٹرا

کے اُٹھ اُٹھ کر راج بھائی کو کرسی پیش کرتے اور جب وہ اُن میں سے کسی کی پیش کی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتا تو وہ سارے پروانوں کے مانند اُس کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس کے بعد دو قسم کی باتیں سُننے میں آتیں۔ ایکسٹرا لڑکوں کی زبان پر پُرانی فلموں میں راج بھائی کے کام کی تعریف کی اور خود راج کشور کی زبان پر اُس کے اسکول چھوڑ کر کالج اور کالج چھوڑ کر فلمی دُنیا میں داخل ہونے کی تاریخ۔ چونکہ مجھے یہ سب باتیں زبانی یاد ہو چکی تھیں اس لیے جوں ہی راج کشور ہوٹل میں داخل ہوتا، میں اُس سے علیک سلیک کرنے کے بعد باہر نکل جاتا۔

ایک روز جب بارش تھمی ہوئی تھی اور ہر مز جی فرامز جی کا اسپشن کتا نیاز محمد کی دو بلیوں سے ڈر کر گلاب کے ہوٹل کی طرف دُم دبائے بھاگا آرہا تھا، میں نے مولسری کے درخت کے نیچے بنے ہوئے گول چبوترے پر نیلم اور راج کشور کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ راج کشور کھڑا حسبِ عادت ہولے ہولے جھول رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے خیال کے مطابق نہایت ہی دل چسپ باتیں کر رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ نیلم سے راج کشور کا تعارف کب اور کس طرح ہوا تھا مگر نیلم تو اُسے فلمی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ہی اچھی طرح جانتی تھی اور شاید ایک دو مرتبہ اُس نے مجھ سے برسبیلِ تذکرہ اُس کی تعریف بھی کی تھی۔ میں گلاب کے ہوٹل سے نکل کر ریکارڈنگ رُوم کے چھجے تک پہنچا تو راج کشور نے اپنے چوڑے کندھے سے کھادی کا تھیلا ایک جھٹکے کے ساتھ اُتارا اور اُسے کھول کر ایک موٹی کاپی باہر نکالی۔ میں سمجھ گیا، یہ راج کشور کی ڈائری تھی۔

ہر روز تمام کاموں سے فارغ ہو کر اپنی سوتیلی ماں کی آشیرواد لے کر راج کشور سونے سے پہلے ڈائری لکھنے کا عادی ہے۔ یوں تو اُسے پنجابی زبان بہت عزیز ہے مگر یہ روزنامچہ انگریزی میں لکھتا ہے جس میں کہیں ٹیگور کے نازک اسٹائل کی اور کہیں گاندھی کے سیاسی طرز کی جھلک نظر آتی ہے۔ اُس کی تحریر پر شکسپیئر کے ڈراموں کا اثر بھی کافی ہے مگر مجھے اس مرکب میں لکھنے والے کا خلوص کبھی نظر نہیں آیا۔ اگر یہ ڈائری کبھی آپ کو مل جائے تو آپ کو راج کشور کی زندگی کے دس پندرہ برسوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اُس نے کتنے روپے چندے میں دیئے، کتنے غریبوں کو کھانا کھلایا، کتنے جلسوں میں شرکت کی، کیا پہنا، کیا اُتارا، اور اگر میرا قیاس درست ہے تو آپ کو اس ڈائری میں کسی ورق پر میرے نام کے ساتھ پینتیس روپے بھی نظر آجائیں گے جو میں نے اُس سے ایک بار قرض لیے تھے اور اس خیال سے ابھی تک واپس نہیں کیے کہ وہ اپنی ڈائری میں ان کی واپسی کا ذکر کبھی نہیں کرے گا۔

خیر، نیلم کو وہ اس ڈائری کے چند اوراق پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ میں نے دُور ہی سے اُس کے خوب صورت ہونٹوں کی جنبش سے معلوم کر لیا کہ وہ شکسپیرین انداز میں پربھو کی حمد بیان کر رہا ہے۔ نیلم مولسری کے درخت کے نیچے گول سیمنٹ لگے چبوترے پر خاموش بیٹھی تھی، اُس کے چہرے کی ملیح متانت پر راج کشور کے الفاظ کوئی اثر پیدا نہیں کر رہے تھے۔ راج کشور کے کُرتے کے بٹن کھلے تھے اور سفید بدن پر اس کی چھاتی کے کالے بال بہت ہی خوب صورت معلوم ہوتے تھے۔ اسٹوڈیو میں چاروں طرف ہر چیز دُھلی ہوئی تھی۔ نیاز محمد کی دو بلیاں بھی جو عام طور پر غلیظ رہا کرتی تھیں، اُس روز بہت صاف اور ستھری دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں سامنے بینچ پر لیٹی نرم نرم پنجوں سے اپنا منہ دھو رہی تھیں۔ نیلم جارجٹ کی بے داغ سفید ساڑی میں ملبوس تھی۔ بلاؤز سفید لیس کا تھا جو اُس کی سانولی اور سڈول بانہوں کے ساتھ ایک نہایت ہی خوش گوار اور مدھم سا تضاد پیدا کر رہا تھا۔ نیلم اتنی مختلف کیوں دکھائی دے رہی ہے؟ ایک لحظے کے لیے یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا اور جب ایک دم اُس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے اُس کی نگاہ کے اضطراب میں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ نیلم محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ جب راج کشور چلا گیا تو اُس نے مجھ سے کہا۔ ”آج آپ میرے ساتھ چلیے گا۔“

شام کو چھ بجے میں نیلم کے مکان پر تھا۔ جوں ہی ہم اندر داخل ہوئے، اُس نے اپنا بیگ صوفے پر پھینکا اور مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا۔ ”آپ نے جو کچھ سوچا ہے، غلط ہے۔“

میں اُس کا مطلب سمجھ گیا تھا چنانچہ میں نے جواب دیا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے کیا سوچا تھا؟“

اُس کے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی پُراسرار مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ”اس لیے کہ ہم نے ایک ہی بات سوچی تھی۔ آپ نے شاید بعد میں غور کیا۔ مگر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہم دونوں غلط تھے۔“

”اگر میں کہوں کہ ہم دونوں صحیح تھے۔“

اُس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو ہم دونوں بے وقوف ہیں۔“ یہ کہہ کر فوراً ہی اُس کے چہرے کی سنجیدگی اور زیادہ سنولا گئی۔ ”صادق! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں بچی ہوں جو مجھے اپنے دل کا حال معلوم نہیں۔ تمہارے خیال کے مطابق میری عمر کیا ہو گی؟“

”بائیس سال“

"بالکل درست۔ میرے دل میں اب کیا خاک کسی کی محبت پیدا ہوگی۔" یہ کہہ کر اُس نے میرے منجمد چہرے کی طرف دیکھا اور مضطرب ہو کر کہا۔ "تم کبھی نہیں مانو گے، میں تمہارے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دوں پھر بھی تم یقین نہیں کرو گے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ...... بھئی خدا کی قسم، وہ مر جائے جو تم سے جھوٹ بولے۔ میرے دل میں اب کسی کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ....." یہ کہتے کہتے وہ ایک دم رُک گئی۔

میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ گہری فکر میں غرق ہو گئی تھی، وہ شاید سوچ رہی تھی کہ "اتنا ضرور" کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے پتلے ہونٹوں پر وہی خفیف پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی جس سے اُس کے چہرے کی سنجیدگی میں تھوڑی سی عالمانہ شرارت پیدا ہو گئی تھی۔ صوفے سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر اُس نے کہنا شروع کیا۔

"میں ضرور کہہ سکتی ہوں کہ یہ محبت نہیں ہے، کوئی اور بلا ہو تو ہو میں کہہ نہیں سکتی۔ صادق! میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔"

میں نے فوراً ہی کہا۔ "یعنی تم اپنے آپ کو یقین دلاتی ہو۔"

وہ جل گئی۔ "تم بہت کمینے ہو۔ کہنے کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔ آخر تمہیں یقین دلانے کی مجھے ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔ میں اپنے آپ کو یقین دلا رہی ہوں مگر مصیبت یہ ہے کہ آ نہیں رہا ہے۔ کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟" یہ کہہ کر وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور داہنے ہاتھ کی چھنگلیا پکڑ کر مجھ سے پوچھنے لگی۔ "راج کشور کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ میرا مطلب ہے، وہ کون سی چیز ہے جو مجھے پسند آئی ہے۔" چھنگلیا چھوڑ کر اُس نے ایک ایک کر کے دوسری انگلیاں پکڑنی شروع کیں۔ "مجھے اُس کی باتیں پسند نہیں، مجھے اُس کی ایکٹنگ پسند نہیں، مجھے اُس کی ڈائری پسند نہیں، جانے آج کیا خرافات سنا رہا تھا۔" خود ہی تنگ آ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "سمجھ میں نہیں آتا، مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

نیلم نے پان دان کھول کر اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میرے لیے پان لگانا شروع کر دیا۔ چاندی کی چھوٹی چھوٹی کلیوں میں سے اُس نے بڑی نفاست سے چمچی کے ساتھ کتھا اور چونا نکال کر رگیں نکالے ہوئے پان پر پھیلایا اور گلوری بنا کر مجھے دی۔ "صادق! تمہارا کیا خیال ہے؟" یہ کہہ کر وہ خالی الذہن ہو گئی۔

میں نے پوچھا۔ "کس بارے میں؟"

اُس نے سروتے سے بھنی ہوئی چھالیا کاٹتے ہوئے کہا۔ "اسی بکواس کے بارے میں جو خواہ مخواہ شروع ہو گئی۔ یہ بکواس نہیں تو اور کیا ہے، یعنی میری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔ خود ہی پھاڑتی ہوں خود ہی رفو کرتی ہوں۔ اگر یہ بکواس جاری رہی تو جانے کیا ہوگا۔"

اس کے بعد نیلم نے بہت دنوں تک راج کشور کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہا مگر اس دوران ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے واقف تھے۔ جو کچھ وہ سوچتی تھی، مجھے معلوم ہو جاتا تھا اور جو میں سوچتا تھا، اُسے معلوم ہو جاتا تھا۔ کئی روز تک یہی خاموش تبادلہ جاری رہا۔

ایک دن ڈائریکٹر کرپلانی جو "بن کی سندری" بنا رہا تھا، ہیروئن کی ریہرسل سن رہا تھا۔ ہم سب میوزک روم میں جمع تھے۔ نیلم ایک کرسی پر بیٹھی اپنے پاؤں کی جنبش سے ہولے ہولے تال دے رہی تھی۔ ایک بازاری قسم کا گانا تھا مگر دھن اچھی تھی۔ جب ریہرسل ختم ہوئی تو راج کشور کندھے پر کھادی کا تھیلا رکھے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈائریکٹر کرپلانی، میوزک ڈائریکٹر گھوش، ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی، این موگھا۔ ان سب کو فرداً فرداً اُس نے انگریزی میں آداب کیا۔ ہیروئن مس عیدن بائی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور کہا۔ "عیدن بہن! کل میں نے آپ کو کرافرڈ مارکیٹ میں دیکھا۔ میں آپ کی بھابی کے لیے موسمبیاں خرید رہا تھا کہ آپ کی موٹر نظر آئی۔" جھولتے جھولتے اُس کی نظر نیلم پر پڑی جو پیانو کے پاس ایک پست قد کرسی میں دھنسی ہوئی تھی۔ ایک دم اُس کے ہاتھ نمسکار کے لیے اُٹھے۔ یہ دیکھتے ہی نیلم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "راج صاحب! مجھے بہن نہ کہیے گا۔"

نیلم نے یہ بات کچھ ایسے انداز میں کہی کہ میوزک روم میں بیٹھے ہوئے سب آدمی ایک لحظے کے لیے مبہوت ہو گئے۔ راج کشور کھسیانا سا ہو گیا اور صرف اس قدر کہہ سکا۔ "کیوں؟" نیلم جواب دیے بغیر باہر نکل گئی۔

تیسرے روز تاگ پاڑے میں سہ پہر کے وقت شام لال پنواڑی کی دکان پر گیا تو وہاں اسی واقعے کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ شام لال بڑے فخریہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "سالی کا اپنا من میلا ہوگا، ورنہ راج بھائی کسی کو بہن کہے اور وہ برا مانے۔ کچھ بھی ہو، اُس کی مراد کبھی پوری نہ ہوگی۔ راج پکا برہمچاری ہے۔"

راج کے برہمچاریے سے میں تنگ آ گیا تھا مگر میں نے شام لال سے کچھ نہ کہا اور خاموش بیٹھا اُس کی اور اُس کے دوست گاہکوں کی باتیں سنتا رہا جن میں مبالغہ زیادہ اور اصلیت کم تھی۔ اسٹوڈیو میں ہر شخص کو میوزک روم کے اس حادثے کا علم تھا اور تین روز سے گفتگو کا موضوع بس یہی چیز تھی کہ راج کشور کو مس نیلم نے کیوں ایک دم بھیا کہنے سے منع کیا۔ میں نے راج کشور کی زبانی اس بارے میں کچھ نہ سنا مگر اُس کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اُس نے اپنی ڈائری میں اس پر نہایت ہی دلچسپ تبصرہ لکھا ہے اور پرارتھنا کی ہے

کر مس نیلم کا دل و دماغ پاک صاف ہو جائے۔

اس حادثے کے بعد کئی دن گزر گئے مگر کوئی قابلِ ذکر بات وقوع پزیر نہ ہوئی۔ نیلم پہلے سے کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی اور راج کشور کے کُرتے کے بٹن اب ہر وقت کھلے رہتے تھے جس میں سے اُس کی سفید ابھری ہوئی چھاتی کے کالے بال باہر جھانکتے رہتے تھے۔ چونکہ ایک دو دن سے بارش تھمی ہوئی تھی اور "بن کی سندری" کا چوتھا سیٹ کارنگ خشک تھا اس لیے ڈائرکٹر کرپلانی نے نوٹس بورڈ پر شوٹنگ کا اعلان چسپاں کر دیا۔ یہ سین جواب لیا جانے والا تھا، نیلم اور راج کشور کے درمیان تھا۔ چونکہ میں نے ہی اس کے مکالمے لکھے تھے اس لیے مجھے معلوم تھا کہ راج کشور باتیں کرتے کرتے نیلم کا ہاتھ چومے گا۔ اُس سین میں چومنے کی بالکل گنجائش نہ تھی مگر عوام کے جذبات اکسانے کے لیے عام طور پر فلموں میں عورتوں کو ایسے لباس پہنائے جاتے ہیں جو لوگوں کو ستائیں اس لیے ڈائرکٹر کرپلانی نے پرانے نسخے کے مطابق دست بوسی کا یہ ٹچ رکھ دیا تھا۔

جب شوٹنگ شروع ہوئی تو میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سیٹ پر موجود تھا۔ راج کشور اور نیلم دونوں کا ردِ عمل کیا ہو گا، اس کے تصور ہی سے میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی مگر سارا سین مکمل ہو گیا اور کچھ نہ ہوا۔ ہر مکالمے کے بعد ایک تھکا دینے والی یک آہنگی کے ساتھ برقی لیمپ روشن اور گل ہو جاتے، اسٹارٹ اور کٹ کی آوازیں بلند ہوتیں اور شام کو جب سین کے کلائمکس کا وقت آیا تو راج کشور نے بڑے رومانی انداز میں نیلم کا ہاتھ پکڑا مگر کیمرے کی طرف پیٹھ کر کے اپنا ہاتھ چوم کر الگ کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ نیلم اپنا ہاتھ کھینچ کر راج کشور کے منہ پر ایک ایسا چانٹا جڑے گی کہ ریکارڈ روم میں پی این موگھا کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے مگر اس کے برعکس مجھے نیلم کے ہونٹوں پر ایک تحلیل شدہ مسکراہٹ دکھائی دی جس میں عورت کے مجروح جذبات کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔

مجھے سخت نا اُمیدی ہوئی تھی مگر میں نے اس کا ذکر نیلم سے نہ کیا۔ دو تین روز گزر گئے اور جب اُس نے بھی مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ کہا تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اُسے اس ہاتھ چومنے والی بات کی اہمیت کا علم ہی نہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اُس کے ذکی الحس دماغ میں اس کا خیال تک نہ آیا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اس وقت راج کشور کی زبان سے جو عورت کو بہن کہنے کا عادی تھا، عاشقانہ الفاظ سُن رہی تھی۔

نیلم کا ہاتھ چومنے کے بجائے راج کشور نے اپنا ہاتھ کیوں چوما تھا؟ کیا اُس نے انتقام لیا تھا؟ کیا اُس نے عورت کو ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی؟ ایسے کئی سوال میرے دماغ میں آئے مگر کوئی جواب نہ ملا۔

چوتھے روز جب میں حسبِ معمول ناگ پاڑے میں شام لال کی دکان پر گیا تو اُس نے مجھ سے شکایت بھرے لہجے میں کہا "منٹو صاحب! آپ تو ہمیں اپنی کمپنی کی بات سُناتے ہی نہیں۔ آپ بتانا ہی نہیں چاہتے یا پھر آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ پتہ ہے آپ کو، راج بھائی نے کیا کیا؟" اس کے بعد اس نے اپنے انداز میں یہ کہانی بیان کرنا شروع کی کہ "بن کی سندری" میں ایک سین تھا جس میں ڈائرکٹر صاحب نے راج بھائی کو مس نیلم کا منہ چومنے کا آرڈر دیا لیکن صاحب کہاں وہ سالی ٹکھیائی، راج بھائی نے فوراً کہہ دیا 'نا صاحب! میں ایسا کام نہیں کروں گا، میری اپنی پتنی ہے۔ اس گندی عورت کا منہ چوم کر کیا میں اُس کے پوتر ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ملا سکتا ہوں'، بس صاحب، فوراً ڈائرکٹر صاحب کو سین بدلنا پڑا اور راج بھائی سے کہا گیا کہ اچھا بھئی، تم منہ نہ چومو، ہاتھ چوم لو مگر راج بھائی نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں، جب وقت آیا تو اُس نے اس صفائی سے اپنا ہاتھ چوما کہ دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوا کہ اُس نے اُس سالی کا ہاتھ چوما ہے۔

میں نے اس گفتگو کا ذکر نیلم سے نہیں کیا اس لیے کہ جب وہ اس سارے قصے ہی سے بے خبر تھی، اُسے رنجیدہ کرنے سے کیا فائدہ تھا۔

بمبئی میں ملیریا عام ہے۔ معلوم نہیں کون سا مہینہ تھا اور کون سی تاریخ تھی، صرف اتنا یاد ہے کہ "بن کی سندری" کا پانچواں سیٹ لگ رہا تھا اور بارش بڑے زوروں پر تھی کہ نیلم اچانک بہت تیز بخار میں مبتلا ہو گئی۔ چونکہ مجھے اسٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھا اُس کی تیمارداری کرتا رہتا۔ ملیریا نے اُس کے چہرے کی سنولاہٹ میں ایک عجیب قسم کی درد انگیز زردی پیدا کر دی تھی۔ اُس کی آنکھوں اور اُس کے پتلے ہونٹوں کے کونوں میں جو ناقابلِ بیان تلخیاں گھلی رہتی تھیں، اب اُن میں ایک بے معلوم بے بسی کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ کونین کے ٹیکوں سے اُس کی سماعت کسی قدر کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اُسے اپنی نحیف آواز اونچی کرنی پڑتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید میرے کان بھی خراب ہو گئے ہیں۔

ایک دن جب اُس کا بخار بالکل دور ہو گیا تھا اور وہ بستر پر لیٹی نقاہت بھرے لہجے میں عیدن بائی کی بیمار پرسی کا شکریہ ادا کر رہی تھی، نیچے سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ یہ آواز سن کر نیلم کے بدن پر ایک سر سے پیر تک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کا دبیز ساگوانی دروازہ کھلا اور راج کشور کھادی کے سفید کرتے اور تنگ پاجامے میں اپنی پرانی وضع کی بیوی کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ عیدن بائی کو اس

نے عیدن بہن کہہ کر سلام کیا، میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنی بیوی
کو جو تیکھے تیکھے نقوش والی گھریلو قسم کی عورت تھی، ہم سب سے متعارف
کرا کے وہ نیلم کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات وہ ایسے ہی خلا میں
مسکراتا رہا پھر اُس نے بیمار نیلم کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی مرتبہ اُس
کی ڈھلی ہوئی آنکھوں میں ایک گرد آلود جذبہ تیرتا ہوا پایا۔
میں ابھی پوری طرح متحیر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُس نے
کھلنڈرے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "بہت دنوں سے
ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی بیمار پرسی کے لیے آؤں مگر اس کم بخت موٹر
کا انجن کچھ ایسا خراب ہوا کہ دس دن کارخانے میں پڑی رہی۔ آج آئی
تو میں نے" اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے "شانتی سے کہا کہ ابھی چلو،
اسی وقت اُٹھو۔ رسوئی کا کام کوئی اور کر لے گا، آج اتفاق سے رکھشا
بندھن کا تہوار بھی ہے۔ نیلم بہن کی خیر و عافیت بھی پوچھ آئیں گے اور
اُن سے رکھشا بھی بندھوائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے کھادی
کے کُرتے سے ایک ریشمی پھُندنے والا گجرا نکالا۔ نیلم کے چہرے کی زردی
اور زیادہ دردانگیز ہو گئی۔ راج کشور جان بوجھ کر نیلم کی طرف نہیں دیکھ
رہا تھا، چنانچہ اُس نے عیدن بائی سے کہا۔ "مگر ایسے نہیں۔ خوشی کا
موقع ہے۔ بہن بیمار بن کر رکھشا نہیں باندھے گی۔ شانتی! چلو اٹھو،
ان کو لپ اسٹک وغیرہ لگاؤ۔ میک اپ بکس وغیرہ کہاں ہے؟"
سامنے مینٹل پیس پر نیلم کا میک اپ بکس پڑا تھا۔ راج کشور
نے چند لمبے لمبے قدم اٹھائے اور اُسے لے آیا۔ نیلم خاموش تھی۔ اُس
کے پتلے ہونٹ بھینچ گئے تھے جیسے وہ اپنی چیخیں بڑی مشکل سے
روک رہی ہے۔ جب شانتی نے پتی ورتا استری کی طرح اُٹھ کر نیلم کا
میک اپ کرنا چاہا تو اُس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ عیدن بائی نے ایک
بے جان لاش کو سہارا دے کر اُٹھایا اور جب شانتی نے نہایت ہی
غیر صناعانہ طریق پر اُس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانا شروع کی تو وہ
میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ نیلم کی یہ مسکراہٹ ایک خاموش چیخ تھی۔
میرا خیال تھا نہیں، مجھے یقین تھا کہ ایک دم کچھ ہو گا۔ نیلم کے
بھینچے ہوئے ہونٹ ایک دھماکے کے ساتھ وا ہوں گے اور جس طرح
برسات میں پہاڑی نالے بڑے بڑے مضبوط بند توڑ کر دیوانہ وار آگے نکل
جاتے ہیں، اسی طرح نیلم اپنے رُکے ہوئے جذبات کے طوفانی بہاؤ میں
ہم سب کے قدم اکھیڑ کر خدا معلوم کن گہرائیوں میں دھکیل لے جائے
گی مگر تعجب ہے کہ وہ بالکل خاموش رہی۔ اُس کے چہرے کی دردانگیز
زردی غازے اور سُرخی کے غبار میں چھپتی رہی اور وہ پتھر کے بُت کی
طرح بے حس بنی رہی۔ آخر میں جب میک اپ مکمل ہو گیا تو اُس نے
راج کشور سے حیرت انگیز طور پر مضبوط لہجے میں کہا۔ "لائیے، اب میں

رکھشا باندھ دوں۔"
ریشمی پھُندنوں والا گجرا تھوڑی دیر میں راج کشور کی کلائی [illegible]
تھا اور نیلم جس کے ہاتھ کانپنے چاہئیں تھے، بڑے سنگین سکون [illegible]
اُس کا تکمہ باندھ رہی تھی۔ اس عمل کے دوران ایک مرتبہ پھر مجھے [illegible]
کی ڈھلی ہوئی آنکھوں میں ایک گرد آلود جذبے کی جھلک نظر آئی [illegible]
جو اُس کی ہنسی میں تحلیل ہو گئی۔ راج کشور نے ایک لفافے میں [illegible]
کے مطابق نیلم کو کچھ روپے دیے جو اُس نے شکریہ ادا کر [illegible]
تکیے کے نیچے رکھ لیے۔
جب وہ لوگ چلے گئے، میں اور نیلم اکیلے رہ گئے تو اُس [illegible]
پر ایک اُجڑی ہوئی نگاہ ڈالی اور تکیے پر سر رکھ کر خاموش لیٹ گئی۔
پلنگ پر راج کشور اپنا تھیلا بھول گیا تھا۔ جب نیلم نے اُسے دیکھا [illegible]
پاؤں سے ایک طرف کر دیا۔ میں تقریباً دو گھنٹے اُس کے پاس بیٹھا [illegible]
پڑھتا رہا۔ جب اُس نے کوئی بات نہ کی تو میں رخصت لیے بغیر چلا [illegible]
اس واقعے کے تین روز بعد میں ناگ پاڑے میں اپنی نور روپے
ماہوار کی کھولی کے اندر بیٹھا شیو کر رہا تھا اور دوسری کھولی سے [illegible]
ہمسائی مسز فرنانڈیز کی گالیاں سن رہا تھا کہ ایک دم کوئی اندر داخل [illegible]
میں نے پلٹ کر دیکھا، نیلم تھی۔
جب میں کرسی کھینچ کر اُس کے پاس بیٹھا تو اُس نے کہا [illegible]
سیدھی یہاں آ رہی ہوں۔"
میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "کہاں سے؟"
"اپنے مکان سے۔ اور میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ اب
وہ بکواس جو شروع ہوئی تھی، ختم ہو گئی ہے۔"
"کیسے؟"
"مجھے معلوم تھا کہ وہ پھر میرے مکان پر آئے گا، اُس وقت
جب اور کوئی نہیں ہو گا۔ چنانچہ وہ آیا، اپنا تھیلا لینے کے لیے۔ اس
حرکت سے مجھے ایک دم نفرت ہو گئی۔ میں نے اُس کو تھیلا دیا اور
کھسیانا ہو کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔"
یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی، مُردے کی طرح خاموش۔ میں [illegible]
اُس کا ایک ہاتھ جو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا، میں نے چھوا [illegible]
طرح گرم تھا۔ "نیلم!..... نیلم!....."
میں نے کئی دفعہ اُسے زور زور سے پکارا مگر اُس نے کوئی جواب
نہ دیا۔ آخر جب میں نے بہت زور سے خوف زدہ آواز میں نیلم کہا تو وہ
چونکی اور اٹھ کر جاتے ہوئے اُس نے صرف اس قدر کہا۔
"سعادت! میرا نام رادھا ہے۔"